سردار محمد امین خاں کھوسو

اِسلامی انقلابی حکومت کی اساس

فکرِ عُبید اللّٰہی

سردار محمد امین خان کھوسو نے یہ مقالہ عوامی فکری محاذ کے زیر انتظام منائے جانے والے یوم عبید اللہ سندھی کے موقع پر بتاریخ ۲۴ اگست ۱۹۶۹ء اریبر ہال، لاہور میں پڑھا تھا۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میرے نزدیک پاکستان کے اہم شہر لاہور میں مولانا عبید اللہ انور، حضرت مولانا احمد علیؒ صاحب کے فرزند اور جانشین خود حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کے تربیت یافتہ شاگرد کے زیر صدارت آج کے حالات میں جب کہ بیت المقدس پر آگ کے شعلے برسائے گئے ہیں "یوم حضرت مولانا عبید اللہ سندھی" کا انعقاد ایک تاریخی اور اہم واقعہ ہے۔ پاکستان میں اسلام کی تو نہیں مسلمانوں کی حکومت ہے۔ مسلمانانِ پاکستان نہ صرف خود میدان جہاد میں نکل آئیں، بلکہ حکومت کو بھی اس حد تک مجبور کر دیں کہ وہ پورے عالم اسلام کو اکٹھا کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ اسلامی اتحاد اگر آج بھی نہ ہو سکا تو پھر شاید اس کا موقع دوبارہ نہیں آئے گا۔ مسجدِ اقصیٰ پر جو آگ برسائی گئی ہے اس کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اسرائیل کو اکھاڑ کر

اس جہاں میں جہنم رسید کیا جائے۔ وقت آگیا ہے کہ مسلمان حکومتیں اور مسلمان ملتیں ایک بار پھر جغرافیائی حدود توڑ کر حفاظتِ اسلام کے لئے اسلام ہی کے جھنڈے تلے جمع ہوجائیں۔ ایک عوامی تحریک اسی مقصد کے لئے پورے ملک میں بلا دریغ شروع کی جائے۔ غیر اسلامی طاقتوں کو اس کا احساس ہوچلا ہے کہ مسلمان اکٹھے نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ ان سے زیادہ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں ان کا یہ چیلنج قبول کرلینا چاہئے اور دکھا دینا چاہئے کہ جہاں اسلام کی بقاء کا سوال ہے ہم سب اختلافات کو بھلا سکتے ہیں اور ہم میں کوئی اونچ نیچ باقی نہیں رہ سکتی۔ ہمیں جنرل یحییٰ خاں صدر مملکت پاکستان کو اپنے اس عزم سے آگاہ کرنا چاہئے۔

اب میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس کی جسارت نہ کرتا کہ کسی ٹھوس علمی کام کے سرانجام دینے سے پہلے حضرت مولانا کے متعلق کسی مجمع میں بولنے پر آمادہ ہوتا۔ لیکن حضرت مولانا کی روحانی تائید درایں بارہ محسوس کرتا ہوں اس لئے آپ کے سامنے حاضری کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مقدس ہے:

"میری اُمت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی مانند ہیں"

امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھی بلاشبہ ایسے ہی عالم ربانی ہیں۔ ان کی زندگی کو اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو شروع سے لے کر اخیر تک وہ غلبۂ اسلام اور جہاد کی تعلیم و تربیت دیتے ہوئے اس جہاں سے رخصت ہوئے۔ ان کی تعلیمات کی رُوح تک پہنچنے کے لئے ان کی زندگی کے واقعات سے واقفیت حاصل کرنا بالکل ضروری ہوجاتا ہے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ آپ سیالکوٹ کے سکھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ والد پہلے مرچکا تھا۔ اس طرح وہ اپنی ماں اور بہنوں کے واحد سہارے تھے۔ اس قسم کی خاندانی محبت اور رشتے کو توڑ کر وہ داخل اسلام ہوئے۔ ان کے وُجود کا یہ داخلی انقلاب کوئی معمولی واقعہ نہیں کہ اسے سرسری طور سے دیکھا جائے کفر سے رشتہ کاٹ کر اسلام تک وہ خود پہنچے۔ اور پھر مزید تعلیمات حاصل کرنے کی غرض سے

سندھ کی طرف روانہ ہوگئے اور سیدھے جُنید وقت سیدی و مرشدی حضرت حافظ محمد صدیق صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھرچونڈی شریف متصل ڈھرکی اسٹیشن ضلع سکھر کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اور ان سے قادری طریقے میں بیعت ہوئے۔ اپنے مُرشد سے ان کو جو لگاؤ تھا، اس کا بیان الفاظ کے دائرے میں نہیں لایا جاسکتا۔ ان کی روحانی زندگی ایک انقلابی کی زندگی تھی، اس میں مصائب و تکالیف کا آنا بالکل ایک قُدرتی بات تھی، لیکن جس قسم کی تکلیفیں انھوں نے دیکھیں وہ شاید ہی کسی کے حصّے میں آئی ہوں لیکن ان سب حالات میں وہ شاکر وصابر رہے۔ یہ مرتبہ انھوں نے اپنے پیر و آقا سے حاصل کیا۔

حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عبیداللہ نے اللہ کی خاطر اپنے ماں باپ چھوڑے، اب ہم اللہ کی خاطر اس کے ماں باپ ہیں۔ مُرشد سے محبت کی وجہ سے وہ سندھی کہلائے۔

بھرچونڈی شریف سے وہ دیوبند گئے، جہاں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ جیسے استاذ سے ان کا پالا پڑا۔ یہ بھی ہمارے پیر و مُرشد اور آقا حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بدولت ان کو نصیب ہوا۔ حضرت نے دعا مانگی کہ ان کا پالا کسی راسخ اُستاذ سے پڑے۔ شیخ الہند کا خطاب بھی حضرت محمود حسنؒ کو اس کے بعد ملا جب کہ اُنھوں نے بھرچونڈی شریف کے اس فقیر کو سبق دیا۔ حضرت مولانا نے حیدرآباد میں ایک تقریر میں (جو ان کی آخری تقریر تھی) فرمایا کہ "میں اپنے آپ کو بھرچونڈی شریف کا ایک فقیر سمجھتا ہوں"۔ جس مردِ حق پرست نے خود اپنے وُجود پر سے کُفر کا جو قبضہ تھا اس کو توڑ کر رکھ دیا، وہ ہند پر کافرانہ حکومت کیسے برداشت کرسکتا تھا۔ بظاہر اپنے استاذ کا شاگرد، لیکن سیاست میں اور کُفر کی دشمنی میں اتنا پکّا اور راسخ کہ وہ اپنے استاذ کا بھی اس مُعاملے میں اُستاذ بنا۔ ہندوستان سے انگریز حکومت ختم کرنے پر یہ انقلابی جم گیا۔

رولٹ کمیٹی کے انگریز لکھنے والوں نے اس کی خُوب وضاحت کی ہے کہ دیوبند کے مدرسے کو ایک سکھ نومسلمان نے تحریکِ آزادی و انقلاب کا اپنے استاذ کو بھکا کر مرکز بنالیا۔ پُورے ہندوستان میں انگریز کو زیر و زبر کرنے کے لئے مکمل بغاوت کیسے کی جائے، اس کا

مکمل نقشہ تیار کیا۔ اس کے بعد معاونین و مددگار پیدا کرنے کے سلسلے میں سندھ، دہلی علیگڑھ وغیرہ مقامات پر وہ جاتے رہے فتح پوری میں جب وہ قرآن پڑھاتے تھے تو اس کے ساتھ ساتھ وہ جہاد کے عملی پہلوؤں پر بھی وضاحت سے گفتگو کرتے تھے۔ انگریز حاکموں کے پاس ان کی تقریروں کا باقاعدہ ریکارڈ جمع ہوتا گیا۔ انھوں نے محسوس کرلیا کہ اگر مولانا کو جلد گرفتار نہ کرلیا گیا تو پورے ہندوستان میں یہ بغاوت کرانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ کیفیت جب یہ تھی تو حضرت شیخ الہند نے انھیں کابل ہجرت کرکے جانے کو کہا۔ پھر چونڈی شریف اور امروٹ شریف سے ہوتے ہوئے بلوچستان کے ذریعے مولانا کابل پہنچ گئے۔ کابل کے حالات کا انھوں نے پورا جائزہ لیا۔ امیر حبیب اللہ خان حاکم کابل انگریزوں کا دوست تھا۔ ایک پورے و پکے معاملہ فہم انقلابی اور فوجی جرنیل کی طرح مولانا موقع کی تلاش میں رہے۔ چنانچہ یہ سب کو علم ہے کہ حبیب اللہ خان جلال آباد میں شہید کردیئے گئے اور سپہ سالار نادر خان اور ان کے بھائی پابجولاں کابل پہنچا دیئے گئے۔ اور کابل کے تخت پر امیر حبیب اللہ خان کے چھوٹے بیٹے امیر امان اللہ خان فائز ہوئے۔ تھوڑے عرصے کے بعد امان اللہ خان کی طرف سے ہندوستان پر افغانستان نے حملہ کیا۔ حملہ آور افواج کے سالار اعظم غازی محمد نادر شاہ بادشاہ تھے۔ حضرت مولانا سندھی نے حملہ آور فوج کو ہر قسم کی امداد دینے کا حکم ہندوستانی ہندو مسلم کو اپنے ایک اعلان کے ذریعہ دیا۔ یہ اعلان انھوں نے حکومتِ وقت کے خارجی و حربی وزیر کی حیثیت میں دیا تھا۔ اور یہ اعلان تاریخ آزادئ ہند کی اہم دستاویز ہے، جس کے نتیجے میں افغانستان مکمل آزاد ہوا۔ اور ہندوستان کی آزادی کی بات بین الاقوامی سطح پر ایک حقیقت بن کر رہی۔ کابل ہی میں حضرت مولانا نے انڈین نیشنل کانگرس کی شاخ کی بنیاد رکھی اور کابل ہی سے حکومت ہند موقتلا کا اعلان کیا اور حضرت مولانا اس کے وزیر خارجہ بنے۔

انگریز اب مولانا کی کابل میں موجودگی سے بالکل خائف ہوگئے۔ انھیں یقین ہوگیا کہ یہ اولو العزم انقلابی اگر کابل میں زیادہ دیر ٹھہرا تو عملاً ہندوستان میں بغاوت ہوجائے گی۔ چنانچہ انھوں نے اب ہز میجسٹی امان اللہ خان پر دباؤ ڈالا کہ یا وہ مولانا کو انگریزوں کے حوالے کردیں

یا اگر وہ کابل میں رہتے ہیں تو انھیں سیاسی نظر بندی میں رکھا جائے۔ مولانا نے امیر امان اللہ خان سے کہا کہ آپ اپنی طرف سے کوئی ایسی بات نہ کہیں اور نہ کریں۔ ہم خود افغانستان سے چلے جائیں گے۔ چنانچہ یہ محسن افغانستان عالم دین جس کی ہمت اور معاملہ فہمی کی وجہ سے بغیر کسی قربانی کے افغانستان کو آزادی ملی تھی وہ اپنے مختصر سا تھیوں کے ٹولے کے ساتھ کابل کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوگیا۔

لیکن دنیا نے یہ بھی دیکھ لیا کہ امان اللہ خان بھی اس کے بعد تخت بادشاہی نہ رہ سکے اور افغانستان کی بادشاہی پھر اس مرد غازی کے ہاتھ آئی جس کا خاندان حضرت مولانا کا معتقد تھا یعنی امیر شہید محمد نادر شاہ بادشاہ۔ اور آج کل کابل کے تخت پر امیر شہید کا فرزند ظاہر شاہ موجود ہے، اور اگر وہ دعوٰی کریں کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی ان کا ہے تو اس میں وہ حق بجانب ہوں گے اور اگر ہم کہیں کہ وہ ہمارے ہیں تو اس میں ہم بھی حق بجانب ہوں گے اور اگر اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو افغانستان اور پاکستان کے درمیان بہت سی غلط فہمیاں دُور کی جاسکتی ہیں۔ لیکن یہ جتلائے کون؟ اور حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کا نام اس طرح لے کون؟

اس سلسلہ میں ایک بات جُملہ معترضہ کی صُورت میں کہنا چاہتا ہوں کہ جس طرح افغانستان کے تخت پر حضرت مولانا کے معتقدین تخت نشین ہیں بعینہٖ اسی طرح ہندوستان میں بھی جہانگیر و عالمگیر کے بعد سب سے اولین مسلمان حکمران، نوعیت اس حکمرانی کی جو کچھ بھی ہو، مولانا کا معتقد ڈاکٹر ذاکر حُسین خاں بنا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی عقیدت حضرت مولانا کے ساتھ بالکل واضح اور عیاں رہی۔ کئی مہینوں تک مولانا کو انھوں نے مہمان رکھا اور ان کی ذاتی خدمت گزاری کی۔ اللہ ان کی رُوح کو ابدی آرام نصیب کرے۔

ماسکو کے قیام کے دوران حکومت ہند کے فارن منسٹر کی حیثیت سے مولانا نے روسی گورنمنٹ کے وزیر خارجہ چچرن سے ملاقات کی۔ اس طرح ہندوستان کی آزادی کی تحریک کی امداد اور معاونت اس وقت کی روسی گورنمنٹ سے انھوں نے حاصل کرلی۔ مولانا کے اسلامی طور وطریقے، نماز، روزہ وغیرہ پر کسی قسم کی پابندی نہ تھی۔ حکومت کے بڑے حکام سے مولانا

اسلام کے متعلق بھی آزادانہ طور پر باتیں کرتے رہے۔ اس وقت کسی پُر آشوب تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مولانا اگر وہاں نہ ہوتے تو شاید روسی گورنمنٹ کے تعلقات ترکستان، ایران اور افغانستان کے ساتھ زیادہ خراب ہوجاتے۔

یہ حضرت مولانا کا ذاتی اثر و رسوخ تھا، جس نے حالات کو زیادہ خراب ہونے سے بچالیا۔ مولانا کی زندگی کے ان گوشوں پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔

ماسکو سے مولانا ترکی پہنچے اور وہاں بیٹھ کر انھوں نے ہندوستان میں کس طرح انگریزی حکومت کو ختم کیا جائے، اس کے متعلق پروگرام شائع کیا۔ اس پروگرام میں انھوں نے مسلم اکثریت والے ٹکڑوں میں علٰحدہ اور ہندو اکثریت والے صوبوں میں علٰحدہ حکومت بنانے کی تجویز پیش کی۔ لیکن پورا ملک پھر بھی ٹکڑے ٹکڑے نہ ہوا۔ نہ معلوم اس قسم کی تجویز پر عمل کرنے کے جو نتائج ہوتے وہ کہاں تک ہمیں موجودہ تکالیف سے بچاسکتے۔

بہرنوع یہی مولانا پورے ہندوستان پر غلبۂ اسلام کے داعی تھے۔ اسلام کا یہ غلبہ وہ فکری اور ذہنی تبدیلی کے ذریعے سے لانا چاہتے تھے۔ اور بظاہر حکومت پر اس قسم کی پارٹی کو قابض رکھنا چاہتے تھے، جس پارٹی کا فکری نظام ولی اللّٰہی یا دوسرے الفاظ میں عبیداللّٰہی ہو۔ حضرت مولانا نے بار بار دہلی کو مسلمانانِ ہند کا ذہنی مرکز مانا ہے تو ہم جو مولانا کے ماننے والے ہیں وہ اس سے کیوں مایوس ہوں کہ دہلی پر ہی عبیداللّٰہی فکر دوبارہ قابض نہ ہوگا۔

ترکی سے یورپ کے راستے سے مولانا حجاز پہنچے۔ حجاز سے مولانا کی واپسی کے لئے سندھ کی حکومت نے گورنمنٹ ہند کو لکھا۔ اور سندھ کی حکومت کا وزیراعظم اس وقت میرادوست خان بہادر اللہ بخش شہید تھا۔ اور میں سندھ اسمبلی کا واحد مسلمان کانگرسی مسلمان ممبر تھا۔

جب مولانا نے کراچی کے ساحل پر قدم رکھا تو میرے دوست شہید اللہ بخش وزیراعظم سندھ استقبال کے لئے موجود تھا۔ میں اس سے پہلے ایک سندھی ہفت روزہ آزاد کانگرسی پرچے کا ایڈیٹر تھا اور اس پرچے کے ذریعے مولانا کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اصل مولانا کی آمد

کی وجہ سندھ کی حکومت تھی۔ جنھوں نے گورنمنٹ آف انڈیا کو یقین دہانی کی کہ وہ مولانا کو اپنے ہاں رکھنے میں کوئی اعتراض نہیں رکھتے۔ میری کانگریسی ممبری نے اگر اور کچھ نہیں کیا صرف مولانا ہی کو ہندوستان واپس لانے میں کامیاب ہوئی تو مجھے اس پر فخر ہے۔

نازم بہ کفر خویش کہ ایمان برابر است

مولانا یہاں آنے کے بعد خاموش نہ رہے وہ اپنے مقصد کی بات کہتے رہے وہ انقلابی تھے اور حکومت ساز تھے۔ مولانا کی تعلیمات ایک عالم دین کی تعلیمات ہیں لیکن وہ تعلیمات مسجد کی چار دیواری اور حجرے کے کمرے تک محدود ہونے والی تعلیمات نہیں ہیں۔ مولانا ملک اور قوم کے سب سے بڑے طبقے یعنی کسان اور مزدور کو جگا کر اس کو ہی حکومت چلانے کے حق دار بنانے کے داعی تھے لیکن یہ سیاست قطعاً دینی اور اسلامی قسم کی سیاست ہے۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہم فکر عبیداللہی کا سہارا لے کر اس ملک میں ایسی حکومت کا ڈھانچہ تیار کریں جو عدل و مساوات اسلام کا عملی نمونہ ہو۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں اس وقت کسی حکومت سے تصادم پیدا کرنے کی تعلیم پھیلا رہا ہوں۔ میرا یہ ارادہ قطعاً نہیں ہے ذہنی طور پر بھی میں کسی حکومت سے تصادم کو ضروری نہیں سمجھتا۔ لیکن اپنی جگہ پر عبیداللہی فکر کو بھی چھوڑنے پر تیار نہیں ہوں۔ یہ فکر ذہنی لنگڑے لولوں کا فکر نہیں ہوسکتا۔

ہمیں آنکھیں کھول کر حالات کا جائزہ لینا پڑے گا اور حالات کی روشنی میں عملی اقدام کی راہیں بھی طے کرنی ہوں گی۔ پوری انسانیت کی فلاح اور بھلائی اسلام کے ذریعے ممکن ہے۔ یہ ہے عبیداللہی فکر کا نچوڑ اور ماحصل۔ جو فکر عالمگیر وسعتیں رکھتا ہو کیا ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ اسے کم از کم اپنے ملک میں رائج کریں۔

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کی مجھ غریب پر جو عنایت تھی اس کے ثبوت میں ان کا ایک فقرہ درج کرتا ہوں۔ محمد بن قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج کے قیام کا اعلان کرتے ہوئے مولانا میرے کام کی تعریف میں فرماتے ہیں :

"ہمارا پارٹی نظام سندھ اسمبلی میں نمودار ہوگا۔"

"ہمارا یہ کام بڑھ رہا ہے مگر بہت آہستہ آہستہ۔"

حضرت مولانا کی آمد سے پہلے میری جو کیفیت تھی وہ باقی نہ رہ سکی۔ حق و صداقت کے اس پیغامبر کے دیکھنے کے بعد میری صنم پرستیاں قائم نہ رہ سکیں۔

بالا بلند عشوہ گر سرو ناز من
کوتاہ کرد قصۂ زہد دراز من

حضرت مولانا خود روزانہ یا ایک روز چھوڑ کر دوسرے دن کھڈہ شریف کراچی سے میرے ہوٹل میں رونق افروز ہوتے تھے۔ انھی ایام میں ایک دفعہ دوپہر کی گرمی میں اکیلے میرے پاس آئے، میرے ہاں کھانا تناول فرمانے کے بعد مجھے شیخ عبدالمجید سندھی پاکستان کے سب سے بڑے زندہ سیاسی لیڈر کے پاس لے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمانے لگے نماز کا وقت ہوگیا ہے وضو کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے بھی وضو کیا۔ اور حضرت مولانا اور شیخ صاحب بھی وضو سے فارغ ہوگئے تو مولانا نے مجھ سے سندھی میں فرمایا تون نماز پڑھاءِ (یعنی تم نماز پڑھاؤ) میں نے متعجب ہو کر پوچھا مان (میں؟) شدت کے ساتھ فرمایا ھاءُ تون۔ (ہاں تم) چنانچہ حضرت مولانا کے حکم کے ساتھ لرزہ براندام آگے کھڑا ہوگیا۔ اپنی عاجزی کے احساس سے میں پوری نماز میں کانپتا رہا۔ جب میں نے سلام پھیرا تو دیکھا کہ مولانا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ دُعا سے پہلے فرمانے لگے، تون نماز پڑھائی رهيو هُئين، اسان الله کان دُعا گھري کہ تو کان، توجھڙن کان اسلام جي خدمت جو کم ڏئي۔ (تم نماز پڑھا رہے تھے ہم اللہ سے دُعا مانگ رہے تھے کہ اللہ تم سے اور تم جیسوں سے اسلام کی خدمت کا کام لے۔

اب میں حضرت مولانا کی رُوح کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان مَروں گا۔ کسی سیاسی گروہ، جماعت یا فرد کی تائید کی یا اس سے سیاست سیکھنے کی اب مجھے ضرورت باقی نہیں رہی۔

میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے کسی جلسہ کی وجہ سے دہلی پہنچا تو معلوم ہوا کہ مولانا جامعہ ملیہ میں ہیں۔ میں دیوانہ وار ان کی زیارت کے لئے جامعہ ملیہ میں پہنچ گیا۔ دُوسرے دن صبح سویرے حضرت مولانا میرے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گئے۔ پورا دن اسی کمرے

میں گزارا۔ میری عاجزیاں ایسے کو میرے ہاں کھینچ کر لائی تھیں۔ مجھے اپنی ان عاجزیوں پر ناز و فخر ہے۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

دُوسرے دن اسی کمرے میں ڈاکٹر ذاکر حسین خان اس وقت کے شیخ الجامعہ جو حضرت مولانا کے میزبان تھے رونق افروز ہوئے۔

جب خان بہادر اللہ بخش وزیر اعظم سندھ دہلی مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کی صدارت کے لئے جارہے تھے، جس میں مولوی کفایت اللہ دہلوی، مولوی سعید احمد، خُود مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لُدھیانوی آصف علی، ڈاکٹر اشرف اور دوسرے نیشلسٹ لیڈر شامل تھے تو حضرت مولانا نے دہلی میں اپنے کسی معتقد سے فرمایا کہ اس کانفرنس کی صدارت کرنے کے لئے اللہ بخش نہیں آرہا، بلکہ ہمارا آرہا ہے۔ اس معتقد نے پوچھا، حضرت ہمارا کون ہے؟ تو ان سے جواب میں فرمایا، تم نہیں جانتے کہ سندھ میں ہمارا کون ہے، سندھ میں ہمارا خان ہی تو ہمارا ہے۔ صدہا و ہزار مرتبہ خود مجھ کو گلے سے لگا کر فرماتے رہے کہ خان! تو ہمارا خان ہے۔ اپنے دوستوں کی محفل میں فرماتے رہے، "خان میرا ہے اور میں خان کا ہوں"۔ حضرت مولانا مجھ سے ہمیشہ سندھی ہی میں گفتگو فرماتے تھے۔

ایک دفعہ میں کراچی میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں دوپہر کو سونے کے لئے لیٹا تو فوراً حضرت مولانا کا خیال آیا میں ننگے سر پوسٹ آفس کی طرف روانہ ہوگیا اور وہاں سے کچھ رقم بذریعہ ارجنٹ تار مولانا کو لاہور بھیج دی جو اس وقت مولانا احمد علی لاہوری کے ہاں قیام پذیر تھے۔ مولانا ایک ڈیڑھ ماہ بعد جب کراچی تشریف لائے تو مجھ سے فرمانے لگے کہ میں بازار میں جارہا تھا کہ مجھے ایک بیگ پسند آیا، میں نے کہا اس میں کاغذات اور کتابیں رکھ لوں اور میں نے خیال کیا کہ میرے خان ہوتے تو ان سے کہتا۔ اس کے بعد دوپہر کو سو رہا تھا کہ ڈاکیے نے تمہارے بھیجے ہوئے پیسے مجھ کو دے دیئے۔

حضرت مولانا کسی بیماری کے آخری ایام میں جب کہ وہ کھڈہ شریف میں مقیم تھے

مجھ کو اپنی بساط کے مطابق خدمت کا پورا موقع ملا - میں اس وقت ہیمن داس وادھوانی کو جو اس وقت سندھ کا وزیر صحت تھا اور جیکب آباد میں ہمارا خاندانی معالج تھا مولانا کے پاس لے جاتا رہا - میں حضرت مولانا سے ادب اور رعب کی وجہ سے کچھ زیادہ کہہ نہیں سکتا تھا میں ان کی طبیعت کے استغناء سے واقف تھا - مولانا سے میں جب ملتا تو ایک قسم کی بے چینی کے آثار ان کے چہرے مبارک پر دیکھتا تو میں نے حضرت مولانا وفائی کو جو حضرت مولانا کی وفات کے بعد میرے دوست و مددگار بنے، دور لے جا کر کہہ دیا کہ حضرت مولانا کا حضرت مولانا محمد صادق کے اوپر کوئی بوجھ نہیں ہے، میں ہی روپیہ وغیرہ کا انتظام کروں گا - جب دوسرے دن میں حضرت مولانا کی خدمت میں پہنچا تو مجھے دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے اور اپنے ساتھ اپنے پہلو میں بٹھا کر گلے لگالیا اور فرمانے لگے کہ تم جو میرے پاس آتے ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے آقا اور پیر حضرت حافظ محمد صدیق علیہ الرحمۃ کے تم فرستادہ ہو - میں نے جب حضرت مولانا کو بتایا کہ میرے رشتے کے نانا حاجی کریم بخش خانصاحب جن کے گاؤں میں حضرت مولانا خود اور حضرت مولانا تاج محمود امروٹی مسلسل مہینوں کے مہینے آکر ٹھہرا کرتے تھے، تو مولانا یہ سن کر بے تاب ہوگئے اور مجھے گلے سے لگا کر بوسے دینے لگے - سندھی میں فرمانے لگے ..."توں ..... کریم بخش جي خاندان ۾ آهين" (تم میرے بھائی کریم بخش کے خاندان میں سے ہو) پھر میں نے یہ بھی بتایا کہ خود میرے والد حاجی عبدالعزیز خاں (مرحوم) مکہ معظمہ میں ان سے ملے تھے - میرے آقا اور پیر عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ بھرچونڈی شریف والے سے بھی حضرت مولانا ملے جب کہ وہ اپنے پیر حضرت حافظ محمد صدیق رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کی زیارت کے لئے بھرچونڈی شریف تشریف لے گئے اور ان سے میری سفارش فرمائی تو میرے حضرت نے مسکرا کر فرمایا وہ تو میرے دوست ہیں - حضرت مولانا نے فرمایا کہ آپ کے دوست ہیں اور مجھے بیحد پیارے ہیں، حضرت پیر عبدالرحمٰن کی دعاؤں سے پاکستان وجود میں آیا اور اب قیامت تک قائم رہے گا -

وقت و عصر کے ان دونوں محافظین اسلام اور مجددین دین کی رحمتیں مجھ عاجز پر

سایہ کئے ہوئی ہیں، جیسے حضرت مولانا نے فرمایا تھا کہ میں پیر حضرت حافظ محمد صدیق علیہ الرحمۃ کی وجہ سے کسی سے مرعوب نہیں ہوتا۔ تو میں بھی کہتا ہوں کہ میں ان دونوں کی بدولت کسی سے مرعوب ہونے والا نہیں۔

حضرت مولانا کے اس قریبی تعلق کا میں نے تفصیلاً اس لئے اظہار کیا ہے کہ ابھی تک یہ واقعات کسی نے دائرۂ تحریر میں نہیں لائے گو کہ سندھ میں اکثر حضرات یا دیگر متعلقینِ مولانا اس سے آشنا و آگاہ ہیں۔

مولانا کی یاد میں رہنا عبادت اور ان کی یاد میں مرنا شہادت ہے۔ آپ سب حضرات مجھ ناچیز کی شکرگزاری کے مستحق ہیں۔ جنھوں نے بندہ نوازی سے کام لے کر مجھے اس دینی و انقلابی جلسہ میں شرکت کا موقعہ عطا کیا۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہم سب کو جزائے خیر دے اور حضرت مولانا کی صحیح انقلابی دینی سیاسیات کی روشنی میں حکومت بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

ملفوظات مولانا عبیداللہ سندھی

ترتیب و تدوین

پروفیسر محمد سرور

قیمت :۔ اٹھارہ روپے

ملنے کا پتہ

سندھ ساگر اکیڈمی ۔ چوک مینار۔ لاہور